ملتان کا پہلا با قاعدہ نظریہ ساز، باشعور جدیدیت پسند شاعر: عرش صدیقی

ڈاکٹر محمد آصف*

Abstract:

The writer of this article has presented a critical study of Arsh Siddiqui's poetry. He has pinpointed those tendencies and attitudes of Arsh Siddiqui which have acquainted him with perception of conscious, humanism, broadmindedness and a jovial society. The writer counts Arsh Siddiqui as the first poet in Multan who has evolved a synthesis of (old and modern of east and west) literature in the tradition of poetry in Multan. He has presented the modern poetic tendencies with concious literary theories. He does not belong to a movement. He has his own theory based on scientific consciousness. He has adopted modernism on the basis of this theory. His theory is free from all the impurities. It emulates balance in life, broadmindedness, joviality and humanism. From this perspective Arsh Siddiqui is the first realistic, conscious and theoretic modern poet in Multan.

> ''جذبوں اور جبلتوں کے بغیر انسانی وجود کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ میں انہیں مانتا ہوں لیکن انہیں ایک عظیم تر قوت یعنی شعور کی رونمائی میں دینے کا مطالبہ ضرور کرتا ہوں اور تخلیقی فن کو زندگی کے تمام معاشرتی اور نفسیاتی حوالوں کے ساتھ شعوری طور پر بھی مربوط اور منظّم کر کے سمجھنے کی کوشش کرنا چاہتا ہوں''(۱)

یہ عرش صدیقی کا نظریۂ شعر ہے جو انہوں نے اپنے شعری مجموعے ''اسے کہنا دسمبر آ گیا ہے'' میں ''میرا نظریۂ شعر'' کے تحت بیان کیا ہے۔ آغاز سے لے کر عرش صدیقی تک ملتان کی شعری روایت پر محض سرسری نظر ہی

* شعبہ اُردو، بہاءالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

ڈال لیجے تو صاف محسوس ہوگا کہ جدید اور سائنٹفک انداز میں شعور کو اپنے جسم و جان کا حصہ بنا کر اپنے ذہن و روح میں اتار کر اسے اپنا مسلک حیات اور مسلکِ شعر بنانے کا اعزاز عرش صدیقی کے حصے میں ہی آتا ہے اور کچھ اس انداز سے کہ عرش صدیقی کے اس نظریہ وعمل کے اثرات واضح طور پر عرش صدیقی کے ہم عصر ملتانی شعراء اور ان کے بعد آنے والے شعراء پر محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ چنانچہ ملتان کی پوری شعری روایت (مثلاً اسد ملتانی، کشفی ملتانی، راجہ عبداللہ نیاز، علامہ طالوت، کیفی جامپوری، صابر دہلوی، عزیز حاصل پوری، ہلال جعفری، قمر لکھنوی، اسلم یوسفی، پرواز جالندھری، حیدر گردیزی، طارق جامی، آنس معین، حزیں صدیقی، ایاز صدیقی، عاصی کرنالی، اسلم انصاری، حسین سحر، اقبال ارشد، ارشد ملتانی، اصغر علی شاہ وغیرہ) (۲) کو بیک نگاہ مدنظر رکھا جائے تو عرش صدیقی ہی وہ شاعر ہیں جنہوں نے شعوری طور پر مشرقی ومغربی ادب اور حیات و کائنات کے حوالے سے جدید علوم کی روشنی میں مطالعہ و مشاہدہ کے بعد اپنا شعور پر مبنی نظریہ ترتیب دیا۔ پھر اس نظریہ کے تحت نہ صرف تحقیقی وتنقیدی تحریریں پیش کیں بلکہ اپنی تخلیقات یعنی افسانوں اور شاعری میں بھی اس نظریے کا شعوری طور پر اطلاق کیا (ہمارے پیش نظر ان کی شاعری ہے) کچھ اس تواتر اور تسلسل کے ساتھ کہ ملتان میں ان کی ذات جدید شعری (وادبی) رویوں کا مرکز بن گئی اس طرح کہ ملتان کی انتہائی قدآور، متحرک ترین اور ترقی پسند شخصیت ڈاکٹر انوار احمد نے بھی تسلیم کیا کہ ''ملتان میں جدید ادبی وشعری رجحانات کی ترویج میں جتنا اہم کردار عرش صدیقی کا ہے اتنا شاید کسی اور کا ہو۔ تخلیق، تدریس اور مجلس تینوں سطحوں پر انہوں نے اپنے معاصرین احباب اور شاگردوں کو جدید نظم کی جانب مائل کیا''(۳)

چنانچہ جہاں تک ملتان میں اردو شاعری کی روایت کا تعلق ہے تو عرش صدیقی ہی نے سب سے پہلے ملتان کے شعراء کو جدید شعری رویوں پر آمادہ کیا، جدید شاعری کی باقاعدہ طور پر نظریہ سازی کی اور ایک ایسا تخلیقی ماحول مجلس، تخلیق اور تدریسی سطح پر پیدا کیا جس کے زیر اثر ملتان کی شاعری متوازن جدیدیت کی طرف گامزن ہوئی اور بالخصوص نئی نسل نے اسے قبول کیا۔ انہوں نے ''غزل سے وابستہ میکانکی مشقوں کی بے وقعتی پر غور کرنا سکھایا خیال کے ساتھ ہئیت، تکنیک اور ابلاغ کے لئے روایت سے وابستہ رہ کر بھی نئے امکانات کی تلاش کی اہمیت سکھائی اور ہمیشہ نومشقوں کا حوصلہ بڑھایا۔''(۴) ڈاکٹر روبینہ ترین نے بھی ''تاریخ ادبیات ملتان'' میں شعروادب کی شعور پر مبنی نظریہ سازی میں عرش صدیقی کی ملتان میں سرپرستی اور اولیت کی نشاندہی کی ہے۔(۵)

عرش صدیقی کی اس جدید شعری شخصیت کی تعمیر وترتیب میں ان کے ماحول اور ان کی شخصیت کا لازمی حصہ ہے۔ عرش صدیقی ۲۱؍جنوری ۱۹۲۷ء کو گورداسپور (مشرقی پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گورداسپور ہی میں حاصل کی۔ ایم اے انگریزی گورنمنٹ کالج لاہور سے کیا۔ ورلڈ یونیورسٹی اری زونا (امریکہ) سے ادب میں

ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ تدریس کا سلسلہ ۱۹۵۵ء میں گورنمنٹ کالج گوجرانوالہ میں انگریزی کے استاد کی حیثیت سے کیا۔ گورنمنٹ کالج مظفرگڑھ اور پھر ایمرسن کالج سے وابستہ ہوئے۔ ۱۹۷۵ء میں ملتان یونیورسٹی (بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان) میں شعبۂ انگریزی کے سربراہ مقرر ہوئے۔ جون ۱۹۷۸ء سے ۱۹۹۰ء تک یونیورسٹی کے رجسٹرار رہے۔ ۱۸/اپریل ۱۹۹۷ء کو پتے کے سرطان کے سبب وفات پائی۔ عرش صدیقی کا اصل نام ارشادالرحمٰن تھا۔ قلمی نام/تخلص عرش صدیقی اختیار کیا۔ عادل فقیر کے نام سے دوہے لکھے(۶)۔ ''دیدۂ یعقوب'' (مجموعۂ نظم و غزل، ۱۹۶۶ء)، ''محبت لفظ تھا مرا'' (مجموعۂ نظم، ۱۹۸۳ء)، ''ہر موجِ ہوا تیز'' (مجموعۂ غزل، ۱۹۸۵ء)، ''کالی رات دے گھنگرو'' (پنجابی نظمیں اور گیت، ۱۹۹۱ء)، ''کملی میں بارات'' (دوہے ۱۹۹۱ء)، ''اسے کہنا دسمبر آ گیا ہے'' (۸ نئی اور ۱۴ پرانی منظومات، ۱۹۹۷ء)۔ ''باہر کفن سے پاؤں'' (افسانوی مجموعہ ۱۹۷۸ء)، ''عرش صدیقی کے سات مستر د افسانے'' مرتبہ، ڈاکٹر طاہر تونسوی (۱۹۹۸ء)، ''تکوین''، ''شعور، سائنسی شعور اور ہم''، ''محاکات'' (تحقیقی و تنقیدی مقالات کے مجموعے) ان کی نظموں، غزلوں، افسانوں اور تحقیقی و تنقیدی مضامین کے مجموعے ہیں۔ یہاں ہمارا موضوع اس وقت ان کی شاعری ہے۔ سو جہاں تک شاعری کا تعلق ہے، اگر ان کے شعری سفر پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں اگرچہ انہوں نے غزل بھی جدید انداز میں کہی ہے تاہم ان کے شعور و ادراک کی نظریں نظم کے جسم کو سڈول بنانے میں زیادہ مصروفِ عمل رہی ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو ان کا اپنا شعری مزاج ہے۔ دوسرے یہ کہ اگرچہ انکے قدم اپنی تہذیبی مٹی میں جمے رہے ہیں تاہم مغربی ادب کے گہرے مطالعے نے انہیں جدیدیت کیطرف مائل کیا ہے۔ عرش صدیقی انگریزی ادب کے استاد تھے لیکن مشرقی علوم کے دشمن نہیں تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ عرش صدیقی مشرقیت سے مغربیت کی طرف آئے اور پھر مغربیت سے انسانیت کی طرف گامزن رہے۔(۷) چنانچہ بنیادی طور پر وہ ''انسان دوست اور باشعور فنکار''(۸) ہیں۔ ''اردو کی ادبی و شعری روایت سے ان کی تخلیقی اور تنقیدی دونوں سطحوں پر شناسائی تھی، انگریزی زبان و ادب کے مطالعے اور تدریس نے ان کی ذہنی و تہذیبی کائنات میں وسعت پیدا کی، مگر اپنی زمین، روایت اور ثقافت میں ان کے قدم جمے رہے''۔ ''نظم و ضبط، توازن، محنت، دیانت، انسان دوستی، اور خردافروزی نے انہیں غیر معمولی انسان اور استاد بنایا، محبت اور علم کے امتزاج نے انہیں ہر عمر اور ہر طبقے کے لوگوں میں مقبول بنایا''۔(۹) یہ ان کا انسان دوستی ہی کا نظریہ تھا کہ مغربی ادبیات کے مطالعے کی بازگشت ان کے افسانوں، تحقیق و تنقید اور شاعری ہر جگہ نظر آتی ہے لیکن اسی ''مغربی ادبیات کے مطالعہ نے ان کی فنکارانہ شخصیت کو تحمل اور توازن عطا کیا ہے''(۱۰) یہ روشن خیالی، وسعت نظری و قلبی، توازن و اعتدال، شعور و ادراک اور جذبہ کی معتدل پیوندکاری، اخلاقی قدروں پر ایمان، محنت و دیانت، ایثار و قربانی، مشرقیت

اورمغربیت کا حسین امتزاج اسلیے ہے کہ ان کا مسلک بنیادی طور پر انسان دوستی ہے اور یہ انسان دوستی اس لیے ہے کہ وہ زندگی کے ہر گوشے کو،شعروادب کے ہر پہلو کو''شعور'' کے نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں جو ہیومنزم یا انسان دوستی کا سرچشمہ ہے۔حتیٰ کہ ان کے نزدیک جذبات کی تہذیب کا نام بھی شعور ہے۔شعور، زندگی اور ادب کے بارے میں انکا نقطۂ نظر کیا ہے خود ان کی زبانی سنیے:

''انسانی شعور نے دریافت کیا کہ انسان کی حدتک جبلتوں کے اظہار پر شعوری پابندیوں اور ضابطوں کا اطلاق معاشرتی زندگی کی بقا کے لیے لازم ہوجاتا ہے جبلتوں کی پہچان اور تہذیب صرف ارتقایافتہ شعور ہی کے ذریعے ممکن ہوسکتی ہے۔واضح رہے کہ یہ عمل جبلتوں کو معدوم یا مغلوب کرنے کا عمل نہیں ہے بلکہ انہیں مہذب بنا کر ان کی تشفّی اور اظہار کے مناسب راستے مقرر کر کے شعور کی مدد سے زندگی میں توازن پیدا کرنے اور ارتقاء کو ممکن بنانے کا عمل ہے۔۔۔۔ہم دیکھتے ہیں کہ ہماری تمام معاشرتی اور تہذیبی ترقی شعور کے ارتقاء کی مرہون منت ہے۔۔۔۔تمام تہذیبی ارتقا شعور کے ارتقا کا مظہر اور نتیجہ ہے اور اس کے برعکس صورتحال کوئی نہیں ہے۔شعور کو یوں جبلتوں کی دشمن قوت قرار دینا جیسا کہ لارنس نے کہا غیر انسانی اور غیر مہذب رویہ ہے۔جبلتوں، جذبوں اور تخیل اور وژن، لاشعور اور تحت الشعور، خواب اور آگہی سب کی اہمیت اور معنویت صرف شعور ہی کے ذریعے حاصل ہوتی ہے۔ جبلتیں اور جذبے اندھے ہوتے ہیں لیکن یہ بات بھی درست ہے کہ شعور انہیں بصارت عطا کرتا ہے۔۔۔۔شاعری،فنون لطیفہ،ثقافت اور تہذیب میں تخلیقی عمل سے طے شدہ نتائج کا مطالبہ نہیں کیا جا سکتا لیکن جس طرح سائنسی شعور جبلتوں کی تہذیب کر کے انہیں سمت عطا کرسکتا ہے اسی طرح سائنسی شعور فنون اور ثقافت وتہذیب کے کردار اور صورت کو متاثر کرسکتا ہے۔۔۔۔فنون میں سائنسی شعور ہونے کا مطلب یہ ہوگا کہ فنکار جبلی تقاضوں کا اسیر ہوکر نہ رہ جائے اور شعور کو کام کرنے کی اجازت دے کر اپنے انسان ہونے کا ثبوت فراہم کرے اور مان لے کہ سب کچھ بدل رہا ہے۔زبان بدل سکتی ہے تشبیہیں کلیشے بن سکتے ہیں، مختلف ادوار میں مختلف فنون مقبول ہو سکتے ہیں انسانی جبلتیں اور جذبے نہیں بدل سکتے لیکن شعور کی رہنمائی نئی سمت عطا کرسکتی ہے۔۔۔۔شاعری کی روایات رقص اور مصوری کی روایات کی طرح ماضی کے ورثے سے مربوط ہوتی ہیں۔ان میں ردوقبول کا جو سلسلہ جاری ہے وہ سائنسی شعور کا مظہر ہے۔اگر شاعر کے پاس وژن ہے اور وہ شاعری کی دیوی کی طرف سے مہربانی، الہام، اور عطا کا منتظر نہیں رہتا تو اس سے توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ کشادہ ذہنی اور سائنسی شعور سے بہرہ ورضرور ہوگا''(۱۱)

یہ پیراگراف اگرچہ طویل ہے لیکن بے حد اہمیت کا حامل ہے۔عرش صدیقی کے نزدیک زندگی کا تمام ارتقاء جذبوں کی تمام تہذیب، ماضی کے ورثے کی صحت مند باز آفرینی، حتیٰ کہ مہذب اور انسانی رویے یعنی انسان

دوستی کی بنیاد شعور پر ہے۔ اس لیے کہ شاعری کا تعلق کشادہ ذہنی اور علم کے ساتھ ہے۔ کشادہ ذہنی، علم، سائنس، موسیقی، شاعری، رقص اور مصوری اور جذبہ کا کوئی مذہب، کوئی نسل، کوئی عقیدہ، کوئی وطن، کوئی قبیلہ نہیں ہوتا۔ یہ اپنی ماہیت اور نوعیت میں تعصّبات سے آزاد اور ماورا ہوتے ہیں۔ ان سب کا عقیدہ صرف ایک ہوتا ہے 'انسانیت'۔ ان سب کا محرک صرف ایک ہے شعور۔ گویا شعور جذبے اور علم پر مبنی جس چیز کو جنم دیتا ہے وہ انسانی دوستی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نشاۃ الثانیہ سے یورپ میں جس روشن خیالی، خرد افزوری اور علم دوستی کی تحریک کا آغاز ہوا اسے ہیومنزم (Humanism) کا نام دیا گیا۔ عرش صدیقی شعری و نثری تحریروں میں اپنے اسی شعور پر مبنی نقطۂ نظر کا اظہار کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کسی خاص سیاسی ادبی یا سماجی گروہ یا تحریک کے رکن کبھی نہیں رہے۔ یہی شعور پر مبنی کشادہ روی، اور انسان دوستی ان کا مسلک ہے۔ یوں وہ آزاد ہونے کے باوجود بھی پابند ہیں ہر تعصب سے آزاد اور اخلاقی ضوابط کے پابند گویا وہ صحیح معنوں میں جدیدیت پسند ہیں۔ ڈاکٹر اے بی اشرف نے درست لکھا ہے کہ:

> ''یہ درست ہے کہ وہ کسی خاص تحریک کے رکن کبھی نہیں رہے لیکن ان کے نظریات ایک وسیع پس منظر میں اور وسیع تر معانی کے ساتھ ہر پہلو سے صحت مندانہ ہیں۔ شاعری ہو یا افسانہ نگاری، عام گفتگو ہو یا سنجیدہ تنقید، وہ جہاں انفرادی اور اجتماعی زندگی کے آلام و مصائب اور مسائل و مشکلات کا واضح شعور رکھتے ہیں وہاں ایک جاندار عزم کے ساتھ دشواریوں پر قابو پانے، مسائل کو حل کرنے اور زندگی کو رومان کی مصنوعی اور عارضی روشنی سے نکال کر حقیقت کی تلخ لیکن حیات افروز دھوپ میں لا کھڑا کرنے کا گُر جانتے ہیں۔۔۔ انہی وسیع تر معانی میں ان کے انسان دوستی کے صحت مندانہ نظریات کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے''(۱۲)

ظاہر ہے انکا یہ نقطہ نظر کسی ادبی سیاسی تحریک سے وابستہ ہو کر وجود میں نہیں آیا بلکہ قدیم و جدید مغربی و مشرقی علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کے شعوری مطالعے و مشاہدے سے وجود میں آیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے شاعری، افسانہ نگاری اور تنقید و تحقیق تینوں کی تخلیق ایک خاص شعوری سطح پر جا کر کی ہے۔

عقل و شعور کی یہ روش غالب، اقبال، فیض اور راشد سے ہوتی ہوئی عرش صدیقی تک پہنچتی ہے۔ اردو نثر میں غالب، سرسید، نیاز فتح پوری، مجنوں گورکھپوری، ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، محمد دین تاثیر، سبط حسن اور احتشام حسین وغیرہ نے بطور خاص اسے اپنایا ہے۔ عرش صدیقی کی نظم، افسانہ نگاری اور تنقید اسی فکری سمت اور رویے کا ایک طاقتور اور بروقت مظہر ہے۔(۱۳) اقبال کے بارے میں عرش صدیقی کا یہ اقتباس درج کرنا یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ اقتباس خود عرش صدیقی کے متوازن شعوری رویے، شعور کی ماہیت اور اقبال کی تخلیقی بلندی کو سامنے لاتا ہے کہ اسی تخلیقی بلندی کی پیروی کرنے کی عرش صدیقی نے کوشش کی ہے۔ عرش صدیقی اقبال کے بارے میں

لکھتے ہیں:

''اقبال کے ہاں عقل کے خلاف اشعار خرد دشمنی اور شعور کے مکمل استرداد کا تقاضا نہیں کرتے اقبال ہی تو ہمارا وہ اہم شاعر ہے جس کے ہاں خرد دوستی اور سائنسی شعور کی فراوانی ہے اور جس کے ہاں انسان کی متضاد قوتوں اور جبلتوں میں آویزش کو تسلیم کر کے توازن تلاش کرنے کی واضح کوشش نظر آتی ہے اور میرے نزدیک یہ توازن ہی وجدان ہے''(۱۴)

عقل وشعور کی یہ روش، یہ توازن واعتدال کا رویہ اور فکر وشعور کا یہی وہ اہم نکتہ یا پہلو ہے جو غالب اور اقبال کے ہاں وجدان بن کر نمودار ہوا ہے۔ غالب کے ہاں منتشر صورت میں اور اقبال کے ہاں منظّم انداز میں۔ ''لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ عقل وشعور کی یہ روش، غالب واقبال کے بعد ہماری شاعری کی تاریخ میں کم ہی نظر آتی ہے۔ اردو کی ادبی نثر کا بھی کم بیش یہی حال ہے''۔(۱۵) عرش صدیقی کی تحریریں، چاہے وہ شعری ہوں یا تحقیقی وتنقیدی یا افسانوی، اسی فکری جہت کے لیے راہوں کو ہموار کرتی ہیں۔ عرش صدیقی نے محض نظری سطح پر ہی شعور اور سائنسی شعور کے مباحث پیش نہیں کیے بلکہ ان کی تحریریں عملی طور پر بھی اسی سائنٹفک تجزیہ وتحلیل پر مبنی سلیقے سے مزین ہیں۔ عرش صدیقی کی تمام تخلیقات خواہ وہ ان کی غزلیں، نظمیں ہوں یا افسانے یا ان کی تحقیقی وتنقیدی کاوشیں سب کی سب ایک باشعور جدید اور متوازن ذہن، ایک فلسفیانہ فکر اور سائنسی شعور کے امتزاج، رومان کی سحر زدہ فضا میں معروضی آدرش کے اختلاط، خیال انگیز احساس، تفکر آمیز تخیل، تامل پسند طبیعت، داخلیت کا معروضیت میں بدل جانا، غرض تمام تحریریں اسی متوازن ذہن کی زائیدہ وتربیت یافتہ نظر آئیں گی۔ یہی باشعور ذہن اپنے پورے وسیع پس منظر، اور معنویت کے ساتھ، جو عرش صدیقی سے مخصوص ہے، ان کی شاعری بالخصوص نظموں کے موضوعات اور اسالیب میں بھی ملتا ہے، شعری مجموعوں کے دیباچوں میں بھی، افسانوں میں بھی، تنقیدی اور تحقیقی تحریروں میں بھی، ادبی مجالس اور گفتگو میں بھی۔ جہاں تک شاعری کا تعلق ہے تو وہ ملتان میں پہلے باقاعدہ شاعر ہیں جنھوں نے ایک شاعر کی حیثیت سے شعور اور سائنسی شعور کے حوالے سے منظّم انداز میں نہ صرف نظری اور عملی تنقید کے نمونے پیش کیے بلکہ اپنی شاعری کی صورت میں اپنے ان نظریات کا اطلاق بھی کیا۔ یوں وہ ملتان کے شعراء کے حلقے میں پہلے باقاعدہ شاعر ہیں جو اتنے جدید اور وسیع تناظر میں شعوری سطح پر اس فکری روش کو اپنی نظموں میں پیش کرتے ہیں اور غالباً یہی وجہ ہے کہ ان کی توجہ غزل سے زیادہ نظم کی طرف رہی ہے۔

اگر ان کے ماحول اور تمہید کو دیکھا جائے تو دراصل ان کی شاعری ایک ایسے معاشرے کی پیداوار ہے جس میں انتشار، روابط کی ٹوٹ پھوٹ، انسانیت اور اخلاقیت کا زوال، محبت کا کھوکھلا پن، یکسانیت اور میکانیت، صنعتی

نظام کی بے حسی، اپنے کلچر، روایات اور ثقافت سے گریز، دونسلوں کا ٹکراؤ اور کشاکش موجود ہو۔ جس میں تشکیک، بے یقینی، معاشی بدحالی، جہالت، مفلسی، ذہنی غلامی، علم وشعور سے فرار اور طبقاتی کشمکش پائی جاتی ہو، جس میں تنہائی، مایوسی، شکست خواہشات، داخلی کرب کے عناصر کارفرما ہوں، جنسی دلدل میں دھنسا ہوا معاشرہ محض جسمانی لذت ہی کو سب کچھ سمجھ رہا ہو۔ بے وفائی، بدمعاملگی، اور احسان فراموشی جس معاشرہ کا وصف خاص ہو۔ اس کے ساتھ محبت وخلوص کے متلاشی لوگ بھی موجود ہوں۔ جو مایوسیوں کی تاریکی میں روشنیوں کے چراغ جلانے کی کوششیں کر رہے ہوں۔ اس کے علاوہ اس معاشرے میں ایک بھرپور ادبی روایت (مثلاً علی گڑھ تحریک، روحانی تحریک، ترقی پسند تحریک، جدید علامتی وتجریدی شاعری کی تحریک وغیرہ) موجود ہو۔ ایسے ہی معاشرے سے عرش صدیقی نے اپنے لیے فکری غذا حاصل کی ہے۔ اور قدیم وجدید مشرقی ومغربی ادباء وشعراء کے اثرات قبول کیے ہیں۔

چنانچہ عرش صدیقی کی شاعری (اور افسانہ وتنقید) کا مطالعہ اس تاریخی سیاسی سماجی ادبی منظر نامے کی تقسیم کے بغیر نہیں کیا جاسکتا جس کا تجزیہ عرش صدیقی نے اپنے شعور بلکہ سائنسی شعور کی آنکھوں سے کیا ہے۔ عرش صدیقی نے ۱۹۲۷ء میں جنم لیا اور ۱۹۹۷ء میں وفات پائی۔ گویا پوری بیسویں صدی کے ذہنی رویوں نے نہ صرف ان کی شخصیت کو متاثر کیا بلکہ ان کی تخلیقات میں کسی نہ کسی صورت میں جگہ بھی پائی۔ چنانچہ علی گڑھ تحریک اور اس کے ادب اور معاشرے پر اثرات، رومانوی تحریک، ترقی پسند تحریک، حلقہ ارباب ذوق، جدیدیت، ادب میں چلنے والی حقیقت پسندی کی تحریکیں ان کے ساتھ علامت ووجودیت کی تحاریک، پھر وہ سیاسی سماجی اور فکری رویے جنھوں نے ان ادبی تحریکوں کو متاثر کیا مثلاً دو عظیم جنگیں اور ان کے نتائج، پرآشوب سیاسی سماجی ذاتی صورتحال، جنگِ عظیم سے قبل براہِ راست نوآبادیاتی نظام اور پھر دوسری جنگ عظیم کے بعد بالواسطہ نوآبادیاتی نظام کے استحصالی شکنجے، اقدار کی ٹوٹ پھوٹ، خونریزی اور قتل عام، انسانی وقار کی بے حرمتی، صنعتی ومشینی نظام کے تحت فرد کا ایک مشینی پرزہ بن کر رہ جانا، جذبات کی موت، کربِ مسلسل، تشکیک، بے یقینی، مادہ پرستی، اقتصادی، لوٹ کھسوٹ، خودغرضی، پیچ در پیچ ذہنی رویے، احساس تنہائی، فرد کی داخلی ٹوٹ پھوٹ، شناخت اور تشخص سے محرومی، انفرادی آزادی کا ختم ہونا ______ غرض یہ پیچیدہ اور لاتعداد متضاد رویے ہیں جنھوں نے بیسویں صدی اور اس دور کے باشعور شعراء وادباء کی تخلیق گری کی ہے۔ پھر مغربی مفکرین کے متنوع فلسفے اور نظریات مثلاً مارکس، ہیگل، لینن، فرائڈ، ینگ، ایڈلر، گورکی، چیخوف، میلارمے، بودلیر وغیرہ کے اثرات، عالمی سطح پر چلنے والی رومانیت، اشتراکیت، وجودیت، جدیدیت اور علامتیت کی تحریکیں پھر برصغیر میں چلنے والی آزادی کی تحریک اور اس کے معاشرے اور گھریلو ماحول پر اثرات، تقسیمِ ہند، فسادات، ہجرت، سقوطِ ڈھاکہ، قیام پاکستان کے بعد ہمارے ملک میں آنے والے آمرانہ نظام اور اس آمریت کی

جبریت، معاشی عدم مساوات، سیاسی استبداد، معاشرتی اقدار کی ٹوٹ پھوٹ، اخلاقی زوال، ان عوامل کے تحت جنم لینے والی انفرادیت اور دروں بینی، نظریاتی بحران، نفسیاتی جنسی الجھنیں، اس پورے سماجی اور سیاسی، منظر نامے میں ابھرنے والی جدیدیت، علامتیت، تجریدیت اور وجودیت کی رو۔غرض یہ وہ سماجی سیاسی اور ادبی چوکھٹا ہے جس میں ہمارے عہد کے ہر بڑے تخلیق کار کی شخصیت پیوست ہے۔ ہمارے عہد کے شاعر، افسانہ نگار، محقق، نقاد اور تخلیق کار کو یہ پوری زندگی، اس عہد کا پورا کمپلیکس اور یہ تمام فنی و ادبی تجربات ورثے کے طور پر ملے ہیں۔عرش صدیقی نے اپنی تمام تخلیقات وتنقیدات میں انہی پیچ در پیچ ذہنی وجذباتی رویوں کو قدیم وجدید علامتی واستعاراتی اسلوب میں بیان کیا ہے۔

اسی تناظر میں ان کے ہاں معاشرتی محرومیوں، خواہشوں، آرزوؤں کی فتح وشکست، وقت کی جبریت اور ابدیت، اقتصادی اور احتیاجی مشکلات، انصاف، محبت، سچائی، خلوص اور سماجی اقدار کی پامالی، مایوسی، تشکیک، نسلوں کی کشمکش، جنسی ہیجان، ماضی کے ورثے سے عدم توجہی یا ماضی کی روایات کا احیاء، احساس تنہائی، مادہ پرستی، اجنبیت وغیریت، مذہبی وسماجی جبریت جیسے موضوعات کو تکنیک کی جدت وتنوع، رومانیت اور حقیقت کے امتزاج، قدیم وجدید علامات واستعارات ماضی کی تلمیحات، تاریخی وثقافتی روایات، ہندی، مصری، یونانی، اسلامی اساطیر (مثلاً دیدۂ یعقوب، آیات قرآنی واحادیث نبوی، پرومتھیس، رادھا، المپس، پاربتی دیوی، زیوس، اپالو، شودیوتا، کاکیشیا وغیرہ) افسانویت اور قصہ پن، چونکا دینے والے انجام، بیانیہ، مکالماتی ڈرامائی اسلوب اور امیجز کے ذریعے بیان کیا گیا ہے۔بحیثیت مجموعی ان کے ہاں امید پرستی، اصولوں کی فتح مندی، انسانی رشتوں کے استحکام، شعور کا غلبہ، رومان کے ساتھ حقیقت کا امتزاج، امکانات کی وسعت، تیقن، انصاف کا رویہ قائم ہے۔

عرش صدیقی اس ادب کے خلاف ہیں جو مصائب سے فرار حاصل کر کے، اپنی ذات کے اندر ڈوب کر، حقائق سے گریز کر کے یاسیت اور قنوطیت کا نمونہ بن کر رہ جائے۔وہ بیمار رومانی رویوں کی بجائے تازہ دم حقائق سے لبریز رومانی رویوں کے قائل ہیں۔ وہ جذبوں کی تہذیب شعور کی رہنمائی میں کرتے ہیں۔ اسی لیے ان کی شاعری کشاکش حیات میں جینے کا قرینہ سکھاتی ہے۔اپنی شاعری کے بارے میں خود ان کا بیان ہے کہ افراد پر شکست، ناکامی، مایوسی، اقدار وانصاف اور محبت وخلوص کی پامالی کی ایسی صورتیں گزر جاتی ہیں کہ وہ بعض اوقات افسردگی کی چادر اوڑھ لیتا ہے۔ لیکن اگر یہ شعور پختہ ہو کہ زندگی کے امکانات کا تسلسل ٹوٹتا نہیں تو زندگی گزارنے کا حوصلہ تازہ دم رہتا ہے۔دیدہ یعقوب کی ابتدائی نظمیں خوفِ مرگ، احساس شکست اور زندگی کی بے معنویت سے پیدا ہوئی ہیں لیکن بعد میں حقیقی شعور حیات حاصل کرنے کے بعد امکانات کی مثبت قدر نے حوصلہ، امید اور یقین کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔(۱۶)

گویا ان کے ہاں شاعری نے بیمار رومانیت سے صحت مند حقیقت تک کا سفر طے کیا ہے۔ چنانچہ ابتدائی

احساسِ شکست سے لبریز یہ مصرعے دیکھیے:

مجھے سب خبر ہے
مرا کچھ نہیں ہے
نہ کہسار میرے
نہ میدان میرا (نظم ''پابہ زنجیر''۔مشمولہ ''دیدہ یعقوب''/کلیات عرش صدیقی)

ابتدائی چند نظموں کو نکال کر ان کی بقایا شاعری ولولہ انگیز ہے۔ مایوسی کے اس دور میں زندہ رہنے کا جواز فراہم کرتی ہے۔ جیلانی کامران نے بالکل درست کہا ہے کہ:

''ایک ایسے دور میں جب انسان کے بارے میں مایوسی کے رویے پیدا ہوئے ہیں۔عرش صدیقی کی نظمیں انسان کے زندہ رہنے کا جواز بنتی ہیں اور ایسے شعری ماحول کو تخلیق کرتی ہیں جس سے گزرتے ہوئے انسان کو زندہ رہنے کا احساس ملتا ہے ان نظموں کا فکری اور شعری لہجہ ہمارے عہد کو اس کی اصل پہچان فراہم کرتا ہے''۔(۱۷)

حیات کی زرخیزی اور عملِ ارتقا عرش صدیقی کے مقصدِ حیات کا لازمی جزو ہے۔عرش صدیقی انسان کی نموپذیری، حیات آفرینی اور تکمیل پذیر زندگی کے ترجمان ہیں۔ زندگی کرنے کی خواہش، آہنی عزم اور مسائل کے باوجود مسلسل محنت کے ذریعے بہتر سے بہتر زندگی گزارنے کی آرزو ان کی شاعری کا نمایاں وصف ہے جسے وہ اپنے مخصوص رومانی اسالیب و تلازمات کے ذریعے بیان کرتے ہیں:

میں سفر میں ہوں لیے کندھوں پہ اپنی رائگاں آزادیوں
کے بے ثمر انچاس سال
میں کہ اب بھی خواہشوں کا جگمگاتا ہاتھ تھامے، تیری ہمری میں ہوں
(نظم ''رائیگاں آزادیوں کے انچاس سال''،مشمولہ ''محبت تھا لفظ میرا''/کلیات عرش صدیقی، ص ۱۱۸)

تری سرد مہری مرے حوصلے کو نمو بخشتی ہے
میں بڑھتا ہوں پھر آہنی عزم لے کر
(نظم ''حد گنبدِ شب''،مشمولہ ''دیدہ یعقوب''/کلیات عرش صدیقی، ص ۸۷)

عرش صدیقی کے ہاں سفر، حرکت، مسلسل عمل بنیادی موضوع ہے۔ان کی نظموں (اور افسانوں) میں ایک طرح کے سفر کی روداد ملتی ہے۔ان کے کردار ایک طویل سفر کرنے کے بعد کہیں پہنچتے ہیں اور کچھ دیر ٹھہر کر روانہ

ہو جاتے ہیں۔ زندگی کا تسلسل وارتقا اسی سفر، حرکت کی بدولت ہے، ایک منزل سے دوسری منزل، دوسری سے تیسری منزل۔۔۔۔ یہ محبتوں کی تلاش کا سفر ہے۔ غیر مختتم سفر۔ ڈاکٹر اے بی اشرف نے درست کہا ہے کہ ''عرش صدیقی کے یہاں سفر تو ہے انجام سفر نہیں اور یہ وہی آدرش ہے جو اقبال کا ہے'' (۱۸)

شاخ اک زیتون کی
بس یہی تھا زادراہ زندگی
لے کے جس کو اک نئے لمبے سفر پر خواہشوں کا
کپکپاتا ہاتھ تھامے اپنے گھر
کے دشت سے نکلا تھا وہ!!

(نظم ''مسافر آخرِ شب کا'' مشمولہ ''محبت لفظ تھا میرا'' / کلیات عرش صدیقی، ص ۱۲۳)

اپنی نظموں میں انہوں نے سماجی اقدار کی پامالی، احسان فراموشی، بے معنویت و بے مقصدیت، بھوک وغیرہ کے مسائل کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ مثلاً ''ہم اندھیروں میں لڑ رہے ہیں'' (محبت لفظ تھا میرا / کلیاتِ عرش صدیقی) میں اہداف کی عدم موجودگی اور اپنی شناخت سے محرومی کو بیان کیا گیا ہے۔ ''اس نے مجھے کیوں روکنا چاہا'' (محبت لفظ تھا میرا / کلیاتِ عرش صدیقی) میں رومانی داستان کے ذریعے دوری، اجنبیت اور بیگانگی کے رویے کو پیش کیا ہے۔ ''میں بے ادب تھا'' (محبت لفظ تھا میرا / کلیاتِ عرش صدیقی) میں رومانی رنگ میں معروضیت کو بیان کیا ہے یعنی تیسری دنیا کے لیے پھولوں کا تحفہ گندم اور چاول کا بدل نہیں بن سکتا۔ ''کامیاب سفر کا انعام'' (محبت لفظ تھا میرا / کلیاتِ عرش صدیقی) میں اس فرد کا انجام بیان کیا ہے جو اپنا خون جگر جلاتا ہے لیکن انعام دوسرے پاتے ہیں۔ تاہم عرش صدیقی مایوس ہو کر تیشے سے اپنا سر نہیں پھوڑ لیتے بلکہ انعام چاہے بغیر حوصلے کے ساتھ اپنے اس سفر کو جاری رکھتے ہیں۔ انہوں نے اس تلخ معروضی حقیقت کو شیریں فرہاد کے قصے کے ذریعے رومانی رنگ میں پیش کیا ہے۔ ''دعائے نیم شبی'' (دیدہ یعقوب / کلیاتِ عرش صدیقی) اپنی ننھی منی بچی سے محبت کے اس لازوال اور آفاقی جذبے کو سامنے لاتی ہے جس میں دعا، عمل، تفکر، جذبہ، تخیل، تصوف، معاش، امید، دل اور شعور تمام اجزاءِ حیات و شخصیت گھل مل گئے ہیں۔ ''دیدہ یعقوب'' (دیدہ یعقوب / کلیاتِ عرش صدیقی) کچھ کھونے اور کچھ پانے کے دو بظاہر متضاد مگر بباطن ہم آہنگ تجربوں کی علامت بن کر ابھرتی ہے۔ یہ وہی ''دیدہ یعقوب'' ہے جس کے بارے میں ڈاکٹر سلیم اختر نے یہ رائے دی تھی کہ ''عرش صدیقی (''دیدہ یعقوب'') نے علامات کے لیے اساطیر کا خزانہ کھنگال کر انہیں اپنے عصر کی تفہیم کے لیے کامیابی سے برتا ہے'' (۱۹) اپنے عصر کی تفہیم کے لیے اساطیر کا استعمال صرف ''دیدہ

یعقوب'' تک ہی محدود نہیں بلکہ ان کا عمومی شعری رویہ ہے۔

''جب رن پڑا'' (محبت لفظ تھا میرا/کلیاتِ عرش صدیقی) میں جاگیرداروں سرمایہ داروں کا ستبداد، اور کسی کی بوئی ہوئی فصل کوئی دوسرا کاٹ لے۔ اس حقیقت کو بیان کیا ہے۔ ''بند کانوں، بند آنکھوں اور بند ذہنوں کے لیے ایک نظم'' (محبت لفظ تھا میرا/کلیاتِ عرش صدیقی) میں اندھے، گونگے، بہرے، اور بے شعور لوگوں کے چلائے ہوئے تیر کھانے کے باوجود حوصلے سے ان کی آنکھیں، کان اور ذہن کھولنے کی کوشش کی ہے اور باور کرایا ہے کہ:

کان بند ہوں تو نہ ایمان نہ یقین
آنکھ بند ہو تو نہ سورج نہ زمین
ذہن بند ہو تو نہ دنیا ہے نہ دین

(محبت لفظ تھا میرا/کلیاتِ عرش صدیقی)

''مُعَمّا'' (اسے کہنا دسمبر آ گیا ہے/کلیاتِ عرش صدیقی) میں اس مادیت اور مادی قید و بند کو بیان کیا ہے جس نے انسان سے انسان کو چھین لیا ہے۔ ''دیکھتا کوئی نہیں'' (اسے کہنا دسمبر آ گیا ہے/کلیاتِ عرش صدیقی) میں مادہ پرستی، تنہائی، میکانیت، اقدار کی تاریکی اور اس کے ساتھ ساتھ موجود روشنی سے فائدہ نہ اٹھانے والے لوگ سامنے آتے ہیں۔ ''کدھر جائے اولادِ آم'' (دیدہ یعقوب/کلیاتِ عرش صدیقی) میں اساطیر کے ذریعے استبداد، بے کسی، اور تنہائی کو بیان کیا ہے۔ ''اے جادوگر'' (دیدہ یعقوب/کلیاتِ عرش صدیقی) میں مذہبی جبر، مذہب کے کھوکھلے پن، مقتدر قوتوں کے استبداد کو بیان کر کے احتجاج کیا ہے۔ ''رشتہ دل'' (دیدہ یعقوب/کلیاتِ عرش صدیقی) میں اجنبیت، تنہائی، اور غیریت کو بیان کیا ہے۔ ''بظاہر جی رہے ہیں ہم'' (اسے کہنا دسمبر آ گیا ہے۔ کلیات عرش صدیقی) ان لوگوں سے متعلق ہے جو جینے کے مفہوم سے ناآشنا ہیں۔ وہ مفہوم جسے نبیوں نے آسمان سے اتار کر مٹی میں گوندھ کر تہذیبوں کی خوشبو میں بسایا تھا۔

غرض ان کی شاعری سماجی ٹوٹ پھوٹ کو سامنے لاتی ہے لیکن ساتھ ہی حوصلہ دیتے ہوئے منزل کی طرف اشارہ بھی کرتی ہے۔ ''بند آنکھوں بند کانوں اور بند ذہنوں کے لیے ایک نظم'' (محبت لفظ تھا میرا/ کلیاتِ عرش صدیقی) اس کی واضح مثال ہے۔

عرش صدیقی کے ہاں موجود دور کے تقاضے کے مطابق حال پر توجہ دی گئی ہے کیونکہ حال درمیان کی کڑی ہے جو ماضی و مستقبل سے ملی ہوئی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

''میں نہ ماضی کا شاعر ہوں نہ مستقبل کا۔۔۔۔ نہ ماضی اور مستقبل دونوں کا۔۔۔۔ مرے پیشِ نظر عموماً

حال کا لمحہ رہا ہے۔۔۔۔ مجھے کسی گزرے ہوئے ماضی کی تلاش ہے نہ میں کسی دہشت ناک ماضی کی یاد سے فرار کا راستہ تلاش کرتا ہوں۔ مجھے مستقبل کی فکر ضرور ہے لیکن مری اصل زندگی مرا حال ہے۔ کیونکہ حال کے لمحے کی ہر کیفیت کسی واقعے کا نتیجہ یا کسی عمل کا ردِعمل ہوتی ہے۔ میں یہ بھی یقین رکھتا ہوں کہ حال ہی مستقبل کی تعمیر کے لیے بنیاد فراہم کرتا ہے''۔ **(۲۰)**

عرش صدیقی ان لوگوں کو ناپسند کرتے ہیں جو اپنے کلچر، تاریخی ورثے، ثقافت سے معذرت خواہ ہیں۔ جو جنسی دلدل میں دھنسے ہوئے ہیں۔ جو بند مقفل دروازوں والے کمروں میں مقید ہیں، جو ماضی یا مستقبل میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ وہ ان لوگوں کے گیت گاتے ہیں جو مصائب کے باوجود معاشرے میں شمعیں جلانے کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں۔ جو اپنی ثقافت اور کلچر کے پاسدار ہیں۔ جو جنسی تہذیب کے قائل ہیں۔ جو حیوانی جبلتوں کو کنٹرول کر سکتے ہیں۔ جو زندگی شعور کی روشنی میں بسر کرتے ہیں اور شعور ہی سے اپنے جذبوں کی تہذیب کرتے ہیں۔ جو اپنے آبا کی خوشبو اپنی مٹی میں بسا کر ایک نیا تاج محل تعمیر کرتے ہیں۔

ڈوبتی راہوں میں چلتا اپنے آبا
کی اس مٹی کی خوشبو کے تعاقب
میں چلا آیا جو میرے خوابوں میں
پلتی تھی

(نظم ''اپنی مٹی کی خوشبو'' مشمولہ، محبت لفظ تھا میرا/کلیاتِ عرش صدیقی)

عرش صدیقی نے یہ تمام موضوعات رومانی و علامتی انداز اور اساطیر و تلمیحات کے ذریعے بیان کیے ہیں۔ وہ اسلوب کے اعتبار سے تو رومانی ہیں لیکن موضوع کے اعتبار سے معروضی۔ جدید نظم نگاروں اور شاعری سے منفرد ایک الگ اسلوب اور جدت وانفرادیت، تحیر، رومانیت، تخیل، جذبہ، جمالیاتی حسن کی تشفی، معاشرتی ناہمواریوں کے ردِعمل میں ایک مہذب رویہ، شرافت و تہذیب، معاشرتی و اخلاقی اقدار کی پابندی، جنس و محبت کا تہذیبی تصور، امید و ارتقا، عقل و جذبہ، رومان و حقیقت، جوش و ہوش، زندگی کے نظریے اور رویوں میں توازن ان کی شاعری کے نمایاں خصائص ہیں۔ ان کی نظموں کے بارے میں احمد ندیم قاسمی کی یہ رائے بڑی برمحل اور صائب ہے۔

''عرش صدیقی انسان کی نمو پذیر، ارتقا پذیر اور تکمیل پذیر زندگی کا ترجمانِ خصوصی ہے اس لیے اس کی نظموں سے مجموعی تاثیر میں شکست خوردگی اور بے دست و پا کر دینے والی کیفیات کا شائبہ نہیں ہوتا''۔

''عرش صدیقی نے فن کے حوالے سے زندگی گزارنے، زندگی کو بامعنی بنانے بلکہ اس کی معنویتوں میں اضافہ کرنے کی ایک ایسی طرح ڈالی ہے کہ جس سے جذبۂ محض اور جبلت کے اسیروں اور آشوب

ذات کے مجروحوں کو سراسر اختلاف ہوگا مگر ان عناصر کو صوفی صد اتفاق ہوگا جو شعور و ادراک کو انسان اور انسانیت کی پہچان قرار دیتے ہیں اور جو جانتے ہیں کہ وجدان کی کیفیتوں تک بھی شعور ہی کے راستے سے رسائی ہوتی ہے۔''(۲۱)

عرش صدیقی کی تمام نظموں (وہ چاہے ''دیدہ یعقوب'' میں شامل ہوں یا ''محبت لفظ تھا میرا'' یا ''اسے کہنا دسمبر آ گیا ہے'') میں، ان کا فکری اور علامتی نظام ایسے رویوں کی نشاندہی کرتا ہے جو ایک منظّم، متوازن، شعوری اور روشن خیال جدیدیت کے پیداوار ہیں۔ اس جدید صنعتی مشینی عہد میں پائے جانے والی بےچینی اور تشکیک، میکانیت اور یکسانیت، بےمعنویت اور لایعنیت، محبت کی شکست، جذبے کی موت، تنہائی اداسی اور یاسیت، مفلسی اور بھوک، داخلی شکست و ریخت، مارشل لاء کا استبداد، انسان کی ایک فرد کی حیثیت سے ٹوٹ پھوٹ، ذات اور شناخت کے اجتماع میں گم ہو جانے کا احساس، پھر خود اجتماع کا انتشار، طبقاتی تفاوت اور آویزش، جنسی جبر اور جنسی بے راہروی کے بےلگام نتائج، خارجی زندگی کی بےسکونی، جنگوں کے نتیجے میں پیدا ہونے والا عدم تحفظ کا احساس، محبت کا 'روٹی' میں بدل جانا، خودغرضی، مفادات، تضادات، بےحسی، انسان کا مشین بن جانا، سماجی اقدار کی بےحاصلی، سماجی نظام اخلاق اور تحریحات وضوابط کی پابندی کے ساتھ جذبے کی بے پناہ آزادی، اجتماعی لاشعور کے اثرات انسانی رویوں پر، وجودیت کے اثرات، آشوبِ ذات، ذہنی خلفشار، خوف و دہشت کا پھیلاؤ، موجودہ دور کا تہذیبی خلا اور بےسمتی لیکن اس تمام تر بھیانک اور خوف و دہشت سے پُر منظرنامے کے باوجود، امید و رجائیت، مسلسل سفر اور حرکت، جدوجہد، مزاحمت اور احتجاج، اس بنجر، خشک صحرا میں محبت کے سرچشموں کی تلاش____ ان سب کو عرش صدیقی نے کہیں علائم و رموز، کہیں استعارات و تشبیہات، کہیں کلاسیکی تلازمات اور ماضی کی تلمیحات، کہیں اساطیری روایات، کہیں براہ راست، کہیں اپنے داخل اور خارج، کہیں شعور اور لاشعور، کہیں تاریخی روایات کلچر اور ثقافت، کہیں جدیدیت اور وجودیت کے پیمانوں کے ذریعے بیان کیا ہے۔ اپنے تخلیقی رویوں میں وہ راشد کے زیادہ قریب ہیں (۲۲) پھر اگر ان کے شعری مجموعوں کا غور سے مطالعہ کیا جائے (حتیٰ کہ افسانوں کو بھی دیکھا جائے) تو ان کے ہاں سیاسی حوالے نہ ہونے کے برابر ہیں۔ وہ بنیادی طور پر معاشرتی آدمی ہیں بلکہ طبقاتی کشمکش بھی ان کے ہاں نمایاں اور مستقل رجحان نہیں ہے۔ وہ سیاسی موضوعات سے گریز کرتے ہیں۔ (۲۳) بہرحال زندگی کا کوئی میدان ہو ہر جگہ ان کا مخصوص نظریہ، شعور اور سائنسی شعور پر مبنی نظریہ کارفرما ہے۔ چونکہ وہ کسی تحریک، کسی گروہ، کسی دبستان سے وابستہ نہیں، ان کا اپنا ایک خاص نظریہ حیات ہے (جیسا کہ گزشتہ سطور میں بیان ہوا) اس لیے ان کے ہاں موضوعات کا تنوع بھی ہے اور اسالیب اور تکنیک کی رنگارنگی بھی۔ ان کا اسلوب، ان کی تکنیک، ان کا زندگی کرنے

برتنے اور تخلیق میں پیش کرنے کا انداز مرکب اور امتزاجی ہے ایسا اس لیے بھی ہے کہ ان کے نزدیک زندگی امتزاجی کیفیت کا نام ہے چنانچہ ان کی تخلیقات کو سمجھنے کے لیے کئی زاویوں سے ان کی تفہیم اور ان کا مطالعہ ضروری ہے۔ان کے ہاں مرکب نظریات مل کر ایک خاص ترکیب پاتے ہیں۔ یہ ترکیب ان کے نظریۂ شعور کے تحت وجود میں آتی ہے۔اس لیے مرکب نظریات کا حامل ہونے کے باوجود ان کی تخلیقات کے مطالعے اور تفہیم میں دشواری پیش نہیں آئی اور نہ تخلیقی حسن مجروح ہوتا ہے بلکہ ہر نظم میں ایک نئی تازگی کا احساس جنم لیتا ہے۔زندگی پوری ہمہ ہمی کے ساتھ کروٹیں بدلتی ہوئی، لہریں لیتی ہوئی ان کی تخلیقات میں جلوہ گر محسوس ہوتی ہے۔ان کے رویے جدیدیت کے قریب ہیں۔لیکن یہ جدیدیت ان کے شعور (یعنی نظریۂ شعور) کی روشنی میں ایک توازن کے ساتھ جنم لیتی ہے۔اس لیے اس جدیدیت میں غیر نظریاتی پن اور انتشار نہیں ہے، نہ یہ جدیدیت انسان یا فرد کو سماجی روابط سے منقطع کرتی ہے، نہ یہ جدیدیت فرد کو بے آسرا کر کے تنہائی، مایوسی، موت وشکست کے اندھیروں میں دھکیلتی ہے اور نہ یہ جدیدیت علامت اور اساطیر کو ابہام کے دھندلکوں میں لپیٹتی ہے بلکہ یہ وہ جدیدیت ہے جو ایک نظریہ (شعور پر مبنی نظریے) کی حامل ہے اور یہ نظریہ انہی سے مخصوص ہے، یہ وہ جدیدیت ہے جو فرد کو انفرادیت عطا کرنے کے ساتھ ساتھ اسے روح عصر سے ہم آہنگ کرتی ہے۔ جو اندھیروں میں امید کی کرن بن جاتی ہے، جو فرسودگی اور رجعت کے خلاف ایک زبردست تخلیقی قوت اور ردعمل کے طور پر نمایاں ہوتی ہے۔ جو ماضی میں دفن ہونے کے بجائے تہذیب وثقافت کے تخلیقی عمل کو زندہ رکھتی ہے۔جس میں علامت بھی ابلاغ کا فریضہ سرانجام دیتا ہے۔ یہ وہ جدیدیت ہے جس میں تنظیم، توازن، روشن خیالی، انسانی دوستی، قدروں کی جستجو ہے۔ یہ وہ جدیدیت ہے جسے پورے شعور وادراک کے ساتھ اختیار کیا گیا ہے۔اور اس میں ادبی اور تخلیقی سطح پر باقاعدہ نظریہ سازی کی گئی ہے۔اس لیے یہ جدیدیت حیات سوز، زندگی گریز اور دیگر منفی رویوں سے آزاد ہے۔

مندرجہ بالا تمام تر مباحث کی بنیاد پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ کم سے کم ملتان کی سطح پر عرش صدیقی سب سے پہلے باقاعدہ شاعر ہیں جنہوں نے پورے شعور وادراک کے ساتھ تخلیقی عمل اختیار کیا اور اس کا اظہار کیا۔اگر ملتان کی تمام شعری روایت کو مدنظر رکھا جائے تو وہ ملتان کے شعراء کے حلقے میں (یا ملتان کی شعری روایت میں) پہلے باقاعدہ شاعر ہیں جنہوں نے قدیم وجدید مشرقی ومغربی (بالخصوص انگریزی) ادب اور فلسفہ کے مطالعے اور مشاہدے کے بعد پورے شعور کے ساتھ نظریہ سازی کی، جدید شعری رویوں کو پیش کیا، اور ان جدید شعری رویوں کے لیے ملتان میں شعری فضا کو ہموار کیا۔ وہ کسی تحریک سے وابستہ نہیں تھے، ان کا اپنا ایک شعور اور سائنسی شعور پر مبنی نظریہ ہے اسی نظریے کے تحت وہ زندگی اور ادب کو دیکھتے ہیں، اسی نظریے کے تحت انہوں نے ایک صحت مند جدیدیت کو اختیار

کیا۔ یہ وہ جدیدیت ہے جو صحیح معنوں میں انسان دوستی اور روشن خیالی پر مبنی کرتی ہے۔اس اعتبار سے وہ ملتان کے پہلے باقاعدہ و باضابطہ باشعور نظریہ ساز جدیدیت پسند شاعر ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ عرش صدیقی، ڈاکٹر ''میرا نظریہ شعر''مشمولہ ''اسے کہنا دسمبر آ گیا ہے'' گورا پبلشرز، لاہور، ۱۹۹۷ء، ص ۱۶۳

۲۔ ملتان کی شعری روایت پر تحقیقی وتنقیدی حوالوں کے لیے مختلف کتب ملاحظہ کی جاسکتی ہیں، مثلاً:

i۔طاہر تونسوی، ڈاکٹر، ملتان میں اردو شاعری، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۱۹۸۴ء؛

ii۔روبینہ ترین، ڈاکٹر ''ملتان کی ادبی وتہذیبی زندگی میں صوفیائے کرام کا حصہ'' بیکن بکس، ملتان، ۲۰۱۱؛

iii۔روبینہ ترین، ڈاکٹر ''تاریخ ادبیات ملتان، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۱۲؛

iv۔محمد آصف ڈاکٹر، حزیں صدیقی، شخصیت اور شاعری، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۱۲؛

v۔شازیہ عنبرین، ڈاکٹر، ملتان میں جدید اردو نظم کی روایت، شعبہ اردو، بہاءالدین زکریا یونیورسٹی ملتان، ۲۰۰۳؛

vi۔مختار ظفر، ڈاکٹر ''ملتان کی شعری روایت بحوالہ راجہ عبداللہ نیاز، اسد ملتانی، علامہ طالوت، کشفی ملتانی، کیفی جامپوری اور شفقت کاظمی'' (غیر مطبوعہ تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ڈی اردو)، بہاءالدین زکریا یونیورسٹی ملتان، ۱۹۹۳ء

۳۔ انوار احمد، ڈاکٹر ''عرش صدیقی: شعور وادراک کے پرچارک جذباتی انسان'' (خاکہ)، مشمولہ، یادگارِ زمانہ ہیں جو لوگ، از، انوار احمد، ڈاکٹر، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۰۸ء، ص ۲۳

۴۔ ایضاً، ص ۲۳

۵۔ روبینہ ترین، ڈاکٹر، تاریخ ادبیات ملتان، ص ۱۷۱

۶۔ عرش صدیقی کی سوانح اور تخلیقی شخصیت کا تعارف حاصل کرنے کے لیے مختلف ماخذات کو ملاحظہ کیا جا سکتا ہے مثلاً دیکھیے:

i۔انوار احمد، ڈاکٹر، اردو افسانہ: ایک صدی کا قصہ، مثال پبلشرز، ۲۰۱۰ء؛

ii۔انوار احمد، ''عرش صدیقی: شعور وادراک کے پرچارک جذباتی انسان'' (خاکہ)، مشمولہ، یادگار زمانہ ہیں جو لوگ، ص ۲۱ تا ۲۹؛

iii۔عرش صدیقی کی کتاب ''شعور، سائنسی شعور اور ہم'' کے بیک پیج پر لکھا ہوا مختصر سوانح تعارف، (شائع شدہ بیکن بکس، ملتان ۱۹۹۲ء)؛

iv۔کلیات عرش صدیقی (شعری کلیات، مرتبہ محمد حنیف) میں شامل مقدمہ از محمد حنیف، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۱۲ء

۷۔ منظر امکانی، ملاقات، مشمولہ ''باہر کفن سے پاؤں'' از، عرش صدیقی، کاروان ادب، ملتان، ۱۹۹۳ء، ص ۲۷۰

۸۔ انوار احمد، ڈاکٹر، اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ، ص ۵۰۵

۹۔ انوار احمد، ڈاکٹر، عرش صدیقی: شعور وادراک کے پرچار کر جذباتی انسان' خاکہ (مشمولہ)، یادگار زمانہ ہیں جو لوگ، ص ۲۷، ۲۸

۱۰۔ انوار احمد، ڈاکٹر، اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ، ص ۵۰۵

۱۱۔ عرش صدیقی، ڈاکٹر، شعور، سائنسی شعور اور ہم، ص ۱۷، ۲۳، ۲۹، ۳۰، ۳۲

۱۲۔ اے بی اشرف، ڈاکٹر، عرش صدیقی کی افسانہ نگاری، مشمولہ کچھ نئے اور پرانے افسانہ نگار، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۷ء ص ۹۹؛

یہی مضمون اس نام سے معمولی سے تغیر وتبدل کے ساتھ ''عرش صدیقی کے افسانوی مجموعے 'باہر کفن سے پاؤں''' میں بھی شامل کیا گیا ہے۔ ملاحظہ کیجئے: ص ۲۲۹

۱۳۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے ''شعور، سائنسی شعور اور ہم'' کے ''پیش لفظ'' میں اجمالاً عرش صدیقی کے مقالے کی تقریظ لکھتے ہوئے غالب، اقبال اور سرسید کے حوالے سے اس فکری روش کا اجمالی تذکرہ کیا ہے دیکھیے: مذکورہ 'پیش لفظ' ص ۵ تا ۱۰

۱۴۔ عرش صدیقی، ڈاکٹر، شعور، سائنسی شعور اور ہم، ص ۲۹

۱۵۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، 'پیش لفظ' مشمولہ ''شعور، سائنسی شعور، اور ہم''، ص ۸

۱۶۔ عرش صدیقی، ڈاکٹر، میرا نظریہ شعر، مشمولہ اسے کہنا دسمبر آ گیا ہے، ص ۱۶

۱۷۔ جیلانی کامران، فلیپ ''محبت لفظ تھا میرا''

۱۸۔ اے بی اشرف، ڈاکٹر، کچھ نئے اور پرانے شاعر، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۹ء ص ۱۷۱

۱۹۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ص ۳۰۳

۲۰۔ عرش صدیقی، میرا نظریہ شعر، مشمولہ، اسے کہنا دسمبر آ گیا ہے، ص ۱۷۳

۲۱۔ احمد ندیم قاسمی، فلیپ، محبت لفظ تھا میرا۔

۲۲۔ ڈاکٹر اے بی اشرف نے راشد، مجید امجد، غالب کے ساتھ عرش صدیقی کا نہایت اچھا تقابلی مطالعہ کیا ہے۔ اس کی تفصیل جاننے کے لیے ملاحظہ کیجئے:

اشرف، اے بی، ڈاکٹر، کچھ نئے اور پرانے شاعر، ص ۱۸۰ تا ۱۸۴

۲۳۔ اس پہلو کے لیے بنیادی ماخذات یعنی عرش کی شاعری اور افسانوں کا مطالعہ تو ضروری ہے ہی تاہم اس نکتے کی طرف ان کے ناقدین نے بھی اشارے کیے ہیں مثلاً:

اشرف، اے بی، ڈاکٹر، کچھ نئے اور پرانے شاعر، ص ۱۸۴؛

انوار احمد، ڈاکٹر، اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ، ص ۵۰۶؛

فردوس انور قاضی، ڈاکٹر اردو افسانہ نگاری کے رجحانات، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۹۹ء، ص ۵۴۷